ڈاکٹر تنویر احمد علوی: کلاسیکی ادب کا انسائیکلوپیڈیا

20 فروری 2013 کی رات ٹھیک 12 بج کر 45 منٹ کا وقت تھا۔ میں نے اپنے لیپ ٹاپ کو آن کر کے جیسے ہی انٹرنیٹ سے کنیکٹ کیا ویسے ہی پروفیسر ابن کنول صاحب کا ای میل اسکرین پر فلیش ہونے لگا جس پر لکھا تھا Dr.Tanveer Ahmad Alvi passed away۔ خبر کی تفصیل پڑھنے سے پہلے میں کانپنے لگا۔ کافی دیر تک ای میل باکس کو دیکھتا رہا اور یہ بھول گیا کہ اپنا لیپ ٹاپ میں نے کس لیے آن کیا تھا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہو گئیں اور استاد محترم علوی صاحب سے وابستہ یادیں سمندر کی لہروں کی طرح دل و دماغ میں موجزن ہونے لگیں۔ دہلی یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی اور شعبہ اردو کے ارد گرد کوریڈور کی تصویریں اور ان سے پہلی ملاقات کا منظر آنکھوں میں پھرنے لگا۔ کسی اچھے شعر پر ان کے 'ہائے ہائے لڑکے' کہنے، ان کے کانپتے ہاتھ اور شہادت کی انگلی اپنے شاگردوں کی طرف اٹھا کر مخاطب کرنے کا خاص انداز نظر آنے لگا۔ ان کی لرزتی ہوئی آواز کا ایک ایک منظر یادوں کی اسکرین پر روشن ہوتا گیا۔ ان کے مجموعہ کلام ''لمحوں کی خوشبو'' کے کئی اشعار وردِ زباں ہونے لگے۔ ان کی کتابوں کی تصوریں اور اوراق نظروں کے سامنے خود بخود آنے لگے۔

ڈھائی یا تین سال پہلے میری ان سے آخری ملاقات بھی یاد آنے لگی۔ اب یاد نہیں کہ وہ کون سا دن تھا، کونسی تاریخ تھی جب مجھے خبر ملی کہ علوی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بھاگتا ہوا ان کے گھر گیا۔ ان کو سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کی خیریت دریافت کرنے لگا لیکن انہوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ تم کون ہو؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاتا وہاں پہلے سے موجود ان کی ایک شاگردہ نے ان کے کان کے پاس جا کر کہا کہ یہ عقیل ہیں۔ کون عقیل؟ تو میں نے جواب دیا کہ آپ کا شاگرد۔ لیکن ان کے ردِّعمل میں وہ گرمی نہیں تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کی یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اپنے شاگردوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو کبھی پہچان لیتے اور کبھی نہیں پہچانتے۔ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا لیکن انہیں یاد نہیں تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ اکثر انہیں آواز دیتے تھے اور کھانا مانگتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان کے پاس آنے والے شاگردوں اور شاگرداؤں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے کیوں کہ وہ اب کوئی فائدہ پہنچانے کے لائق نہیں رہے۔ ان کے دونوں بیٹے اپنی اپنی فیملی کے ساتھ باہر رہتے تھے لیکن ان کی اہلیہ کے بھانجے نے ان کی بہت خدمت کی۔ ان کی ایک شاگردہ ڈاکٹر ظلِ ہما اور ان کے شوہر ڈاکٹر شاہد حسین نے بھی آخر آخر تک شاگردی کا حق ادا کیا۔

علوی صاحب کو کوئی خاص بیماری نہیں تھی لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مثانہ کمزور ہو گیا تھا اور باتھ روم تک جلدی پہنچ نہیں پاتے تھے۔ ان کی عمر تقریباً 91 سال ہو چکی تھی جو اپنے آپ میں ایک بہت بڑی بیماری ہے۔ 20 جنوری کو علوی صاحب کو دہلی کے سینٹ اسٹیفن ہوسپٹل میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہاں وہ 27 دنوں تک زیرِ علاج تھے لیکن ڈاکٹروں نے ان کے رشتہ داروں کو انہیں گھر لے جانے کا مشورہ دیا کیوں کہ وہ زندگی کے آخری مرحلے میں تھے۔ اس لیے 17 فروری کو انہیں گھر لایا گیا اور 20 فروری کو شام 8 بج کر 45 منٹ پر وہ اس دنیائے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اللہ ان کو جنت

الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے بیٹوں، رشتہ داروں، عزیزوں اور شاگردوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

علوی صاحب کی موت کی خبر سن کر اردو دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ چاروں طرف صف ماتم بچھ گئی۔ انٹرنیٹ اور فیس بک پر ان کی موت کی خبر اور ان کی تصویروں کو دیکھ کر ہر شخص حیران و پریشان تھا اور ایک دوسرے کو فون کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا۔ ہر شخص یہ کہتا ہوا نظر آیا کہ علوی صاحب ایک فرد نہیں تھے بلکہ ایک انجمن تھے۔ ان کی موت ایک شخص کی موت نہیں ہے بلکہ کلاسیکی ادب کے ایک عہد کی موت ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایسا شفیق استاد، ایسا محقق اور کلاسیکی علم و ادب کا بحر بے کراں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں بھلے ہی اب موجود نہیں ہیں لیکن وہ اپنے شاگردوں اور اردو ادب کے عاشقوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر شریف احمد اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی ایسے استاد تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اپنے شاگردوں کے لیے وقف کر دی تھی۔

ستمبر 1986 کی کون سی تاریخ تھی مجھے یاد نہیں لیکن 12 سے ایک بجے کا وقت تھا میں شعبۂ اردو، (کمرہ نمبر 45) کے سامنے کوریڈور میں کھڑا تھا۔ اسی وقت ایک بزرگ باہر تشریف لائے جن کے سر کے لمبے لمبے بال دائیں اور بائیں طرف لٹک رہے تھے، آنکھوں پر موٹے گلاس اور پرانے ماڈل کے فریم والا چشمہ لگا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں ایک پتلا سا بیگ تھا جسے انہوں نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بیگ کا رنگ میرون تھا۔ گلے میں چوڑی ٹائی بندھی ہوئی تھی لیکن اس کی knot درست نہیں تھی۔ اس ٹائی کا رنگ لال تھا اور شاید ان کے رومال کا رنگ بھی لال ہی تھا جس سے انہوں نے ایک بار اپنے چہرے کو صاف کیا تھا۔ ان کی قمیض اور پینٹ پر بھی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی تھی اور چہرے پر تفکر کا سماں تھا۔ انہیں دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حکیم لقمان یا حکیم بو علی سینا کی طرح کوئی لے جنڈ ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کم سے کم پندرہ بیس طلبا و طالبات ان کے ارد گرد جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے اور تھوڑی سی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگے۔ ان میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ان سب کی بیماریوں کا علاج گویا حکیم صاحب کے پاس ہے۔ جب وہ وہاں سے جانے لگے تو وہاں موجود بیشتر لڑکیاں اور چند لڑکے ان کے پیچھے ہو لئے۔

M.A اردو میں میرا داخلہ ابھی ابھی ہوا تھا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور شبینہ کلاسز کے انچارج ڈاکٹر مغیث فریدی کے علاوہ میں کسی استاد کو اور نہ کسی طالب علم کو ٹھیک سے پہچانتا تھا۔ اس لیے کسی سے ان کے متعلق پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شام میں استاد محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی سے ملاقات ہوئی تو ان کا خاکہ کھینچتے ہوئے ان کے متعلق دریافت کیا کہ وہ صاحب کون تھے تو انہوں نے بتایا کہ وہ اردو، فارسی اور عربی کے ایک بہت بڑے اسکالر اور شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی تھے۔ فریدی صاحب میرے تاثرات سے کافی لطف اندوز ہوئے پھر مسکراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ تم نے انہیں ٹھیک پہچانا وہ ایک حکیم بھی ہیں۔

رفتہ رفتہ میں استاد محترم علوی صاحب کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہو گیا اور ان کی کلاس میں پابندی سے جانے لگا۔ کلاس کے باہر بھی دوسرے طالب علموں کے ساتھ کبھی ان کی علمی و ادبی گفتگو سے مستفید ہوتا تو کبھی تفریحی باتیں سن کر لطف اندوز ہوتا۔ کلاس میں جب وہ لکچر دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کلاس روم میں علم کا سیلاب آ گیا ہے جس کی تیز دھار میں تمام طلبا و طالبات بہتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ میر کی قنوطی شاعری پڑھاتے پڑھاتے میر درد کی شاعری میں عشق مجازی کے موضوع پر لکچر دینے لگتے تھے اور درد کی عشقیہ شاعری پر بات کرتے کرتے ان کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' پر اظہار خیال کرنے لگتے تھے۔ اسی طرح غالب کی شاعری پڑھاتے وقت ذوق کی قصیدہ گوئی اور پھر بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر عالمانہ تقریر کرنے لگتے تھے۔ فراق کی غزلوں پر لکچر دیتے دیتے روپ کی رباعیوں میں پیکر تراشی پڑھانے لگتے تھے۔ علوی صاحب اس طرح کا لکچر صرف کلاس روم میں ہی نہیں بلکہ کلاس روم کے باہر کوریڈور میں، آرٹس فیکلٹی کے ٹی اسٹال کے پاس کھڑے ہو کر، پٹیل چیسٹ کے بس اسٹینڈ پر یہاں تک کہ پرانی دہلی جانے والی بسوں میں بھی کھڑے کھڑے لکچر دینا شروع کر دیتے تھے۔ بس انہیں ذرا سا چھیڑنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

میں نے ایک دفعہ علوی صاحب سے پوچھا تھا کہ سر کیا آپ حکیم بھی ہیں تو کہنے لگے لڑکے حکیم تو اسے کہتے ہیں جو طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد علوم و فنون مثلاً شاعری، علم موسیقی، علم سنگ تراشی، پینٹنگ، علم نجوم وغیرہ وغیرہ کا ماہر ہو۔ پھر ان سے میں نے پوچھا کہ صرف نبض پکڑ کر مرض کا پتہ کیسے لگایا جاتا ہے؟ تو انہوں نے کہا لڑکے ''علم قیافہ'' کے ذریعہ۔ پھر وہ علم قیافہ پر لکچر دینے لگے اور بتانے لگے کہ کیسے ایک ماہر نباض نبض پکڑ مریض کا حال بتادیتا ہے۔ وہ دنیا بھر کے نباضوں کے کارناموں کے متعلق بھی بتانے لگے جن میں چند ایسے بھی تھے جو نبض دیکھ کر یہ بتادیتے تھے کہ مریض نے اس وقت کیا کیا کھایا ہے۔ کچھ تو ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر کسی پاگل کتے نے بھونکا تو وہ سمجھ گئے کہ پاگل پن کا اثر ان میں آگیا ہے اس لیے اپنے شاگردوں سے اپنے نس کا آپریشن کر کے فاسد خون نکلوادیا۔ غرض کسی بھی موضوع پر ذرا سا انہیں چھیڑنے کی دیر تھی وہ لکچر دینا شروع کر دیتے تھے۔

علوی صاحب اردو، فارسی اور عربی کے چلتے پھرتے قاموس تھے۔ کبھی بھی ان سے مل کر یا فون کر کے کسی بھی مشکل سے مشکل لفظ کو جب بھی پوچھا جاتا وہ صرف اس کا معنی ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ اس کے ماخذ پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔ جب تک وہ ہوش و ہواس میں رہے تب تک میں انہیں اکثر فون کر کے کسی نہ کسی لفظ کے معنی پوچھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی قوتِ سامعہ کمزور ہوگئی اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

علوی صاحب کلاسیکی علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا بھی تھے اور مشرقی علوم و ادبیات کا ایک ایسا چشمہ تھے جس کے اندر سے علوم کی کئی دھاریں ہمہ وقت نکلتی رہتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد انہیں اپنے سینے میں محفوظ کرلیں لیکن بہت کم شاگردوں نے علم کے تیز بہاؤ کو اپنی صلاحیت سے اپنے اندر جذب کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ البتہ زیادہ تر شاگرداؤں نے ان بہتے ہوئے علوم کو لٹیروں کی طرح لوٹ لیا اور اپنی ملکیت بنالی۔ علم کی دولت کو سینے میں محفوظ کرنے کے بجائے کاغذ کے اوراق میں منتقل کر کے صاحبِ کتاب بن گئیں۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ کسی بھی حال میں علم کے خزانے کو محفوظ کرلیا جائے۔ اسی لیے اپنے گھر آنے جانے والے شاگردوں اور شاگرداؤں کو کوئی نہ کوئی موضوع دے کر اس پر کام کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ بعض شاگرداؤں کو اس موضوع پر لکھوانے کی پیشکش بھی کرتے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر M.Phil اور Ph.D کے کئی اسکالروں نے M.Phil اور Ph.D کی ڈگریاں حاصل کرلیں۔ اس کا ذکر خود علوی صاحب اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کیا کرتے تھے۔ میں جب بھی ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر جاتا تھا تو وہ بے حد معصومیت سے کہتے تھے کہ میں نے فلاں فلاں کو اِن اِن موضوعات پر لکھوادیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے نام سے شائع کروالیں لیکن افسوس کہ آج تک کسی نے بھی انہیں شائع نہیں کروایا۔ نہ جانے وہ کیا چاہتی ہیں۔ علوی صاحب کی ان اداؤں کو یونیورسٹی کے بعض اساتذہ حضرات ناپسند کرتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد بھی اسے غلط سمجھتے تھے اور ان کے گھر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

پروفیسر قمر رئیس کے دورِ صدارت میں شعبہ اردو سے ایک ٹور آگرہ گیا تھا جس میں قمر رئیس صاحب کے علاوہ علوی صاحب بھی اپنے بیٹے اور تمام چہیتی شاگرداؤں کے ساتھ موجود تھے۔ اس ٹور میں مصر سے آئے ہوئے ایک طالب علم احمد محمد احمد عبدالرحمٰن القاضی اور محمد ظفرالدین بھی تھے۔ احمد قاضی صاحب جامعہ ازہر مصر میں اور ظفرالدین صاحب مولانا آزاد نیشنل اوپین یونیورسٹی حیدرآباد میں پروفیسر ہیں۔ آگرہ کے اس ٹور کو آج تک میں بھلا نہیں پایا کیوں ان دونوں لائق وفائق اساتذہ کے ساتھ آگرے کا قلعہ اور تاج محل دیکھنے کا الگ ہی مزہ تھا۔ علوی صاحب نے مغل بادشاہوں کی تاریخ، مغل آرکی ٹکچر کی انفرادیت اور خصوصیت پر جس طرح روشنی ڈالی تھی یہ کسی معمولی شخصیت کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاج محل پہنچنے سے پہلے آگرہ کے قلعہ میں شاہجہاں کو اورنگ زیب نے کہاں قید کیا تھا۔ کس جگہ سے شاہجہاں تاج محل کو دیکھتا تھا۔ شاہ جہاں قید خانے میں کیا کرتا تھا اور کیا کھاتا تھا وغیرہ وغیرہ باتوں پر سیر حاصل لکچر دیا تھا۔ تاج میں پہنچنے کے بعد پروفیسر قمر رئیس صاحب تاج کے سامنے گھاس پر لیٹ کر تاج محل کو دیکھنے لگے جب ان سے میں نے اندر چلنے کے لیے کہا تو کہنے لگے عقیل میں آنکھوں سے تاج کا حسن پی رہا ہوں مجھے یہیں لیٹے رہنے دو۔ لیکن علوی صاحب ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ تاج محل کے اندر گئے اور گھنٹوں ہمارے ساتھ گھومتے رہے۔ تاج کے نقش ونگار کو خود بھی دیکھتے رہے اور ہم لوگوں کو بھی دکھاتے رہے۔ کہنے لگے کہ یہ نقش ونگار جو تم لوگ دیکھ رہے ہو پہلے ان میں قیمتی ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے لیکن مردود انگریز تمام نادر پتھروں کو نکال کر انگلستان لے گئے۔ یہ رنگ

جوتم دیکھ رہے ہو نقلی ہے۔عربی کی ان عبارتوں کو دیکھو فن خطاطی کی یہ بہترین مثال ہیں۔خطاطی کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے علوی صاحب فن خطاطی پر تفصیل سے لکچر دینے لگے۔بعض عبارتوں کا مفہوم اور تفسیر بھی بیان کرتے رہے۔تاج محل میں مرمر کے جو پتھر لگے ہوئے ہیں انہیں شہنشاہ شاہجہاں نے کہاں سے منگوایا تھا۔ان پتھروں کی خوبیاں کیا ہیں؟ ان کو تراشنے اور نقش و نگار بنانے میں کتنا وقت لگا تھا۔تاج محل کو پہلے بھی میں دیکھ چکا تھا اور اس کے بعد بھی کئی دفعہ دیکھنے کا موقع ملا لیکن جس تاج محل اور آگرہ کے قلعہ کو انہوں نے دکھایا تھا اسے میں کبھی بھی نہیں دیکھ پاتا۔غرض علوی صاحب صرف ادب ہی نہیں بلکہ تمام کلاسیکی علوم و فنون کے ماہر بھی تھے۔

ہندو دیوی دیوتاؤں،اساطیر اور فلسفہ کے متعلق بھی علوی صاحب کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔اکثر ان خواتین کو جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے یا پسند کرتے تھے انہیں کسی نہ کسی ہندو دیوی یا اپسرا مثلاً لکشمی،سرسوتی،پاروتی،مینکا،رمبھا وغیرہ کے نام سے منسوب کر دیتے تھے۔وہ ان دیویؤں اور اپسراؤں کی خصوصیات اور ان کی اساطیری اہمیت پر بھی روشنی دالتے تھے۔ایک دفعہ میں نے ان کو اپنے کالج میں ''ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی معنویت'' پر لکچر دینے کے لیے زحمت دی تھی۔انہوں نے اپنی تقریر کی شروعات بہت اچھی کی اور ویدک دھرم اور اسلام کے مشترکہ فلسفوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندو فلسفہ،اساطیر،دیوی اور دیوتاؤں اور ان کے ملبوسات اور ان ملبوسات میں مختلف قسم کے Symbols،ان کے جسم کے مختلف حصوں کے نشیب و فراز میں چھپے ہوئے فلسفے یا اساطیری قصے اور کہانیوں کی تفصیل کو گھنٹوں بیان کرتے رہے۔آخر میں شیو اور پاروتی کی لازوال محبت کے موضوع پر ایسی فلسفیانہ تقریر کی کہ خاص کر خواتین عش عش کرنے لگیں۔کب تین گھنٹے بیت گئے پتہ ہی نہیں لگا۔پروگرام ختم ہونے کے باوجود گھنٹوں ٹیچرس ان سے باتیں کرتے رہے۔کئی دنوں تک ان کے لکچر کی گونج کالج میں سنائی دیتی رہی مجھ سے انہیں دوبارہ بلانے کی فرمائش ہوتی رہی۔

علوی صاحب انتہائی رومانیت پسند انسان تھے۔وہ اکثر بھکتی مارگ کے فلسفہ پر روشنی دالتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ بھکتی مارگ کے مطابق کوئی شخص اپنی بیوی کے علاوہ کئی عورتوں سے اگر محبت کرتا ہے تو وہ جائز ہے۔وہ بھگوان کرشن کو مثال کے طور پر پیش کرتے تھے اور گوپیوں کے راس لیلا کو جائز قرار دیتے تھے۔اس فلسفہ کا انعکاس بھلے ہی ان کی زندگی پر نہیں تھا لیکن ہمارے سماج میں ہزاروں لوگ آج بھی موجود ہیں جو اس فلسفے کی روشنی میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

رومانیت کا اثر علوی صاحب پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ وہ ہمیشہ خواب و خیال کی دنیا میں رہتے تھے۔کسی بھی خوبصورت شے یا چہرے کو دیکھتے ہی منٹوں میں ایسی ایسی کہانیاں گھڑ دیتے کہ سن کر سبھی حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ان کہانیوں کو اس قدر معصومیت اور سنجیدگی سے سنایا کرتے تھے کہ ایک لمحہ کے لیے ان پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا تھا۔مثلاً ایک دفعہ اپنے کئی شاگردوں اور شاگرداؤں کے درمیان شعبۂ اردو کے سامنے کوریڈور میں کھڑے تھے اور لڑکوں کو مشورہ دے رہے تھے کہ اگر تم کسی زبان کو سیکھنا چاہتے ہو تو اس زبان کو بولنے والی کسی خوبصورت لڑکی سے محبت کرو اور اس کی صحبت میں رہو۔زبان کتابیں پڑھنے سے نہیں زبان دانوں کی صحبت میں رہنے سے آتی ہے۔یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت ان کی ایک شوخ مزاج شاگردہ مسکراتے ہوئے آرہی تھی۔جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچی،علوی صاحب انتہائی سنجیدگی اور معصومیت سے کہنے لگے کہ جب میں پاکستان گیا تھا تو کراچی کی بیچ پر ایک جانی پہچانی سی خوشبو آئی۔میں اس خوشبو کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا لیکن کہیں بھی اس خوشبو کا سراغ نہیں ملا لیکن جب میں ہندوستان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سیما پاکستان گئی ہوئی تھی اور کراچی کے بیچ پر اپنی خوشبو بکھیر کر چلی آئی تھی۔یہ کہانی سنتے ہی سبھی قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔لیکن علوی صاحب نے جب یہ سنانا شروع کیا تو ہم سب یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی سچا واقعہ سنا رہے ہیں لیکن جیسے ہی خوشبو بکھیرنے کی بات کہی تو معلوم ہوا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ ایک فرضی شگوفہ ہے۔اسی طرح ایک دن وہ آرٹس فیکلٹی کی لائبریری کے پاس ایک ٹی اسٹال کے قریب اپنے کئی شاگردوں اور شاگرداؤں کے ساتھ کھڑے تھے۔اچانک علوی صاحب نے ہم لوگوں سے سوال کیا کہ تم لوگوں نے کبھی آئینہ کو لرزتے ہوئے دیکھا ہے؟ سبھی نے کہا کہ نہیں سر۔اس کے بعد علوی صاحب نے کہا کہ جب کوئی خوبصورت چہرہ صبح میں نہا دھو کر آئینہ کے سامنے آتا ہے تو چہرے کی شگفتگی دیکھ کر آئینہ کانپنے لگتا ہے۔سبھی زور زور سے ہنسنے لگے۔

دراصل علوی صاحب کا یہ دلکش انداز بیان تھا جس کی وجہ سے شاگردائیں ہمہ وقت انہیں گھیرے رہتی تھیں۔ یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے باوجود دہلی اور بیرونِ دہلی کی خاتون اسکالرس اس وقت تک ان کے گھر آتی رہیں اوران سے مستفیض ہوتی رہیں جب تک ان کی صحت ٹھیک تھی۔(delete) کسی سمینار میں شریک ہونے کے لیے دہلی میں یا دہلی سے باہر یا بیرون ملک میں بھی گئے تو کوئی نہ کوئی شاگردہ ہمیشہ ان کے ہمراہ گئی۔ بعض شاگردائیں تو انہیں بے حد عقیدت اور محبت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔کبھی کبھی ان کے بدن کے لسان کو دیکھ کر سنسکرت کے اس اشلوک پر یقین آنے لگتا تھا کہ ''عورتیں لتا (بیل) کی مانند ہوتی ہیں جو تناور درخت پر پھیل جاتی ہیں'' اور جب درخت تناور ہونے کے ساتھ ساتھ Legendray بھی تو پھر کیا کہنا۔اس میں نہ تناور درخت کا قصور ہے اور نہ لتیوں کا۔ یہ تو ایک قدرتی فینومینا ہے جو خود بخود ہوتا ہی رہتا ہے۔ ویسے میرے خیال میں علوی صاحب حسن کو چھو کر محظوظ ہونے کے قائل نہیں تھے۔وہ حسن کو صرف دور سے دیکھنے اور محظوظ ہونے کے قائل تھے۔حسرت موہانی کے فلسفہ کے مطابق یہ بھی ایک عبادت ہے۔

سن 1922 کی 16 جولائی اردو زبان وادب کے لیے بابرکت ثابت ہوئی کہ اسی دن یو پی کے مظفرنگر کے پاس ایک مقدس قصبہ' کیرانہ' میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام تنویر رکھا گیا۔اسی تنویر نے آگے چل کر اردو دنیا کو علم کے نور سے منوّر کر دیا۔علوی صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1963 میں Ph.D اور 1967 میں ڈی-لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وہ پہلے ڈی-لٹ تھے۔علوی صاحب دیوبند کے فارغ تھے۔فلسفہ اور منطق کے پرچے میں اتنے مارکس ملے تھے کہ آج تک کوئی ان کا ریکارڈ نہیں توڑ سکا۔وہ طب یونانی کے بھی ٹاپر اور گولڈ میڈلسٹ تھے۔وہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ملازمت کی ابتدا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں استاد کی حیثیت سے کی لیکن کسی اختلاف کی وجہ سے مستعفی ہو گئے اور گھر بیٹھ گئے لیکن دہلی کالج کے پرنسپل نے اس گوہر نایاب کو پہچانا اپنے یہاں بلا کر شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے تقرر کیا۔11 مئی 1977 دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور اس شعبہ کے طلبا کے لیے بابرکت ہے کہ اسی دن علوی صاحب کا شعبۂ اردو میں تقرر ہوا۔یہیں سے جولائی 1983 میں سبکدوش ہو گئے لیکن دہلی یونیورسٹی نے مزید پانچ سال کے لیے Extention دے دیا۔اس طرح وہ جولائی 1988 تک شعبہ اردو سے منسلک رہے۔علوی صاحب کی تقریباً چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں دو ''لمحوں کی خوشبو'' اور ''رقصِ لمحات'' شعری مجموعے ہیں جن میں اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اشعار شامل ہیں۔یہ دونوں شعری مجموعے علوی صاحب کے رومانوی ذہن اور زرکسی فکر ونظر کے آئینے ہیں۔ان کی مشہور تصنیف ''اصولِ تحقیق وترتیبِ متن'' تحقیق کرنے والے اسکالروں کے لیے بنیادی کتاب ہے۔اس کے علاوہ علوی صاحب کی مشہور تصانیف جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں کلیاتِ ذوق، کلیاتِ شاہ نصیر، اردو میں بارہ ماسے کی روایت مطالعہ ومتن، مکتوباتِ عالیہ، ہماری تاریخی یادگاریں، اوراقِ معانی، ارمغانِ غالب، جنوب مغربی ایشیا میں ہماری تہذیبی میراث، سفرناموں میں دلّی وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان کتابوں میں علوی صاحب کی کلاسیکی وتہذیبی تنقید کے نقوش اور تحقیقی بصیرت کے آفاق روشن ہیں۔

علوی صاحب ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور کناڈا بھی تشریف لے جا چکے ہیں اور وہاں کی ادبی محفلوں میں اپنی وسعتِ علمی کا احساس دلا چکے ہیں۔وہ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں بے حد مقبول تھے۔ہر خاص وعام ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کا معترف تھا۔دہلی اردو اکیڈمی نے بھی انہیں 2004 میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے نوازکر ان کے علمی وادبی کاموں کا اعتراف کیا۔علوی صاحب کی موت سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پھر سے پُر کرنا مشکل ہے۔میخانۂ اردو کے رند ہمیشہ ان کو یاد کریں گے اور ان کے غم میں آنسو بہاتے رہیں گے:

مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ 'تجھے'

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad